ڈاکٹر کنزہ نوشیر
لیکچرار یونیورسٹی آف اوکاڑا، اوکاڑا

Dr.Kinza Noshair
Lecturer,
University of Okara, Okara

جدید اردو غزل اور شہزاد احمد کی فکری تشکیل

Modern Urdu Ghazal and Shahzad Ahmad’sIntellectual formation

Abstract: Shehzad Ahmed (1936–2012) holds a distinguished position in modern Urdu Ghazal. From the creation of Pakistan till the contemporary era, the various phases through which Urdu Ghazal has evolved are effectively reflected in the poetic universe of Shehzad Ahmed. He was a well-read and broad-minded poet who, through the influence of modern disciplines such as physics, psychology, and philosophy, expanded the scope of Urdu poetry and enriched the Ghazal with intellectual novelty at the thematic level. The present article particularly attempts to explore and analyze the thematic diversity found in Shehzad Ahmed’s Ghazals, so that a better understanding of his poetic dimension may emerge.

Keywords: Modern, Influence, Well-read, Broad-minded, Novelty of Thought, Thematic, Understanding

شہزاداحمد معاصر ادبی منظرنامے میں ایک ایسے غزل گو شاعر ہیں جن کی غزلوں کا اشاعتی سفر پچپن برس پر محیط ہے یعنی پہلے مجموعہ ”صدف (۱۹۵۸ء)“ سے لے کر آخری مجموعہ ”اربوں سال کی دوری (۲۰۱۳ء)“ تک کا دورانیہ پچپن سال بنتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے تخلیقی سفر کا ایک زاویہ ہے جب شہزاد احمد چھٹی جماعت کے طالب علم تھے تو انھوں نے نظم ”ابر“ (۱۹۴۲ء) لکھی اس رخ سے ان کی غزل گوئی کا سفر ستر سال بنتا ہے۔ یوں لگ بھگ پون صدی کے اس شعری سفر کی وجہ سے شہزاد احمد کو پاکستانی غزل کا ایک شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی غزل جن احساسات اور رجحانات سے ہم کنار ہوتی رہی اس کی آہٹ ہم شہزاد احمد کی غزلوں میں بہت واضح طور پر سن بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔

شہزاد احمد نے جس عہد میں غزل گوئی کا آغاز کیا وہ زمانہ غزل گوئی کی مخالفت کا زمانہ تھا بلکہ اس عہد میں نظم گوئی کی طرف مخصوص قسم کا رجحان تھا ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک میں بہت سے اہم شاعر تھے جو باقاعدہ غزل کی مخالفت کرتے تھے اور بہت سے اہم نام بھی تھے جو ان تحریکوں سے وابستہ ہونے کے باوجود بہت شائستہ اور عمدہ غزل بھی لکھ رہے تھے۔ چالیس، پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں شہزاد احمد نے غزل لکھ کر اور غزل کے ارتقا کے حوالے سے ایک عمدہ شمولیت کی ہے۔ ”صدف“ اور ”جلتی بجھتی آنکھیں“ یکے بعد دیگرے غزلوں کے مجموعے ہیں۔ ”جلتی

بجھتی آنکھیں'' ۱۹۷۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یوں زمانی اعتبار سے یہ زمانہ بھی پاکستان میں نظم گوئی کا زمانہ ہے جس میں میراجی، ن م راشد اور فیض احمد جیسے اہم شاعر بہت عمدہ نظمیں لکھ رہے تھے۔ ان شعرا کے سامنے عمدہ غزل گوئی کا چراغ جلانا شہزاد احمد ہی کا کارنامہ ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے ساتھ تیسرا اہم نام شہزاد احمد کا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ابتدائی طور پر شہزاد احمد کے لڑکپن کا جو زمانہ تھا وہ رومانوی ادب کے اثرات کا زمانہ تھا جس سے انھوں نے جلد ہی فرار حاصل کر لیا اور حقیقت کی طرف رغبت اختیار کر لی۔ ان کی شاعری میں فکری پیش رفت بہت نمایاں ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں انھوں نے عمرانی صورت حال، تشکیک، فلسفیانہ فکر و عوامل، مزاحمت، نفسیاتی عوامل، تلاشِ معنی، ماضی کی زیاں کاری کا احساس، ماحول کی ہولناکی، یادِ رفتگاں جیسے سنجیدہ گفتار موضوعات کو غزل کا حصہ بنایا۔ شہزاد احمد کی موضوعاتی جدت پسندی کے بارے میں ڈاکٹر ضیاالحسن کی ایک رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ''شہزاد احمد ابتداً فطرت کے بے کراں پھیلے مظاہر سے رمز آشنا رہے، عشقیہ موضوعات بھی انھیں مرغوب رہے ہیں اور غزل کا شاعر ان سے فرار حاصل کر بھی نہیں سکتا۔ ستر کی دہائی میں ان کی شاعری میں سیاسی و سماجی موضوعات بھی در آئے۔ مذہبی حوالے سے ابتداً ان کے ہاں تشکیک کا رویہ نظر آتا ہے، لیکن اسی کی دہائی کے اواخر میں خدا سے ایک نئے تعلق کا آغاز ان کی شاعری میں نظر آنے لگا جو بعد میں اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس طرح ان کے فلسفے، نفسیات سائنسوں سے دلچسپی نے بھی ان کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ وسیع کیا''(۱)

شہزاد احمد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی غزلیں پانچ یا سات اشعار پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ گیارہ پندرہ اور اکیس بائیس اشعار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ شعر گوئی کا وفور ان کے ہاں نظر آتا ہے ان کی غزل ندرتِ خیال اور کلاسیک روایت کا حسین امتزاج ہے۔ سائنسی مطالعہ کی وجہ سے وہ جدید غزل کی موضوعاتی سطح پر بدلتی ہوئی فضا کے ہم قدم نظر آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو غزل جن جن مراحل سے گزری ہے اس کی ایک بھرپور اور معتبر گواہی شہزاد احمد کی شعری کائنات میں ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی زبان کو بدلنے کا ذمہ نہیں لیا بلکہ غزل کی روایت اور تغزل کی پاسداری کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر اس کے بنیادی کرداروں اور الفاظ کی نشست میں تبدیلی کر کے موضوعاتی سطح پر اردو غزل کو ورسٹائل غزل بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جو کام لسانی تشکیلات والوں نے لفظی سطح پر کیا وہی کام شہزاد احمد نے معنوی سطح پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل جدید لہجوں کی حامل غزل بن گئی۔ ڈاکٹر انور مسعود کہتے ہیں:

> ''اوہدے کول موضوعات دی بڑی ورائٹی ہے''۔(۲)

موضوعاتی ورائٹی سے بھرپور شاعر شہزاد احمد کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے جدید علوم کو اردو شاعری میں نہ صرف کھپایا بلکہ غزل کو اس قابل بنایا کہ وہ سائنسی، نفسیاتی اور خلائی استعاروں کو بھی شعری زبان میں شامل کرے۔ شہزاد احمد بہت جلد رومانوی فضا سے نکل کر غزل کے اس ماحول میں آ گئے جہاں پر وہ ایسی غزل تخلیق کرنے لگے جو مشاعروں کی واہ واہ سے پاک بلکہ ایک سنجیدہ اور پڑھے لکھے قاری کی توجہ کی حامل بن گئی۔

اگر ہم ان کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں ایک عجب سیمابی تھی وہ زندگی بھر مختلف شعبہ ہائے روزگار سے منسلک رہے مختلف شہروں میں رہے۔ وہ وسیع المطالعہ بھی تھے اور وسیع النظر بھی۔ مشاہدے کی اس رنگارنگی نے ان کی بسیار نویسی کو بھی کامیابی کی ضمانت بخشی۔ زود گوئی عموماً بڑی شاعری کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے مگر شہزاد احمد ایسے شاعر ہیں جب وہ شاعری سے تھکتے تو خود کو تازہ کرنے

کے لیے فزکس کیمسٹری پڑھنے لگتے۔ایسا شخص جس کے لیے سائنسی علوم تازہ ہوا کا جھونکا ہوں اور اس کی بنیادی تعلیم میں نفسیات اور فلسفہ کا رنگ موجود ہو وہ کیوں کر موضوعاتی سطح پر محدود دائرے کا شاعر ہو سکتا ہے۔بقول ڈاکٹر فخر الحق نوری:

''دراصل شہزاد احمد ان بزرگوں میں نہیں ہیں جو ذہن سے ان بوجھل پہیلیوں کو جھٹک کر اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔انھیں تو جیتے جی،دل میں کھلبلی مچانے والے پرانے اور نئے سوالوں کے جواب چاہیے''۔(۳)

۱۹۴۷ء کا سال ۱۸۵۷ء کے سال کی طرح لوگوں کی اجتماعی زندگی پر بہت اثر انداز ہوا۔تخلیقی اور ثقافتی زندگی بہت متاثر ہوئی،لوگوں کا زندگی کے بارے میں ایک طرح سے نقطہ نظر ہی تبدیل ہو گیا۔بہت سے لوگوں نے زندگی کو انفرادی رنگ میں دیکھنے کا انداز اپنا لیا جس وجہ سے ادبی اور تخلیقی لحاظ سے ذہنی اور جذباتی تضاد اور تصادم کی فضا نے بھی جنم لیا۔ہجرت ایک ایسا موضوع تھا جس کا رنگ قیامِ پاکستان کی بعد کی فوری فضا میں بہت واضح نظر آیا۔ساتھ ہی ترقی پسند تحریک بھی عروج پر تھی تو یہ دونوں رنگ ابتدا کی شاعری پر غالب تھے جس میں ایک تیسرا رنگ آزادی پر اظہارِ تاسف کا ملتا ہے کہ شعرا کی ایک تعداد ہے جنھوں نے ایک سنہرا خواب دیکھا مگر قیام پاکستان کے بعد سیاسی،مذہبی اور اخلاقی سطح پر جو نقشہ ابھرا اس سے شعرا کی یہ تعداد بہت پریشان نظر آئی ناصر کاظمی، منیر نیازی، فیض احمد فیض کے بعد شہزاد احمد کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے:

میری آنکھوں میں ہیں وہ جلتے ہوئے بیتاب دن
خلق سایہ مانگتی تھی اور خدا سنتا نہ تھا(۴)

وفا کی لڑی میں ہیں جو پروئے ہوئے
وہ لوگ جمع ہوئے ہیں کئی گھرانوں سے(۵)

شہزاد احمد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے تقسیم کے اثرات کو فوری اور ہنگامی صورت میں بیان نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس حادثے کو اپنے اندر جذب کیا اور تخلیقی شعور کا حصہ بنایا، جس باعث ان کے ہاں تقسیم کے موقع پر پیدا ہونے والے تشدد اور معاشرتی مزاحمت کے بیان میں ایک تخلیقی حسن ہے۔یہ اثرات زیادہ طور پر ان کے پہلے شعری مجموعے ''صدف'' اور اس کے بعد دوسرے شعری مجموعے ''جلتی بجھتی آنکھیں'' تک محدود ہے۔وہ خود بھی ہجرت کے اندوہ ناک مرحلے سے براہ راست گزرے تھے امر تسر سے اٹھ کر لاہور میں آباد ہونے والے شہزاد احمد کے ہاں جذبات کے بہاؤ میں بہنے کا قرینہ نہیں بلکہ ایک فلسفی اور سائنسدان کی طرح سوچنے سمجھنے کا احساس ملتا ہے۔وہ ہجرت کے تجربات کے ساتھ ہی یادِ ماضی کا بہت بڑا موضوع منسلک کرتے ہیں ہجرت اور یادِ ماضی کے امتزاج سے وہ رجائیت کی طرف قدم اٹھاتے ہیں اور کسی بھی طرح اپنے قاری کو یاسیت اور قنوطیت کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

ایک بسے بسائے شہر اور گھر کو چھوڑ کر ایک خواب کے تعاقب میں ملک چھوڑنا آسان کام نہ تھا۔نئے شہر میں آباد ہونے کے بعد حیرانی کا جو تصور شہزاد احمد اور احمد مشتاق کے ہاں نظر آتا ہے وہ بہت منفرد اور اثر انگیز ہے جس میں مکانوں کی خاموشی، دیواروں کی سائے،گلیوں کی بے رونقی،دریچوں کا ویران ہونا،دروازوں کا بے دستک ہونا،آوازوں کا کھو جانا،گھروں اور ان کے صحنوں میں آہٹوں کا سنائی نہ دینا ایسے تلازمات ہیں جو

ان دونوں شاعروں کی شعری کائنات کو بہت منفرد بناتے ہیں۔اس شہر کو چھوڑ کر اس شہر میں آباد ہونا ایک بستی اٹھ کر ایک جنگل میں آباد ہونے کے مترداف تھا جس کا اظہار ناصر کاظمی نے بھی کیا اور شہزاد احمد نے بھی کیا۔اجنبیت کی ایک ایسی تصویر بنائی کہ جس میں حیرانی، دربدری اور ناآشنائی کے مرقعے جابجا جھانکتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

چپ چاپ دریچوں کی طرف دیکھتے پھرتے
زندہ ہیں تو شہزادؔ یہی در بدری ہے(۶)

اس بھرے شہر میں آرام میں کیسے پاؤں
جاگتے چیختے رنگوں کو کہاں لے جاؤں(۷)

پھرتے پھرتے، خاک اڑاتے، کس ویرانے میں پہنچے
یہ کیسا جنگل ہے جس میں جن مبہوت، آدم خاموش(۸)

وطن میں آ کے غربت کی تلخیاں نہ مٹیں
مری خبر تو کبھی میرے آشنا لیتے(۹)

شہزاد احمد کے ہاں یہ رویہ دیرپا نہیں بلکہ ابتدائی چند مجموعوں تک ہے بعد میں شہزاد احمد کے ہاں حب الوطنی کے حوالے سے ایک خوبصورت احساس نظر آتا ہے۔ڈاکٹر نیر صمدانی لکھتے ہیں:

''شہزاد احمد کی شاعری میں ایک کیفیت جو بار بار ابھرتی ہے وہ انسان کے لاشعور سے الجھتے ہوئے سوالوں کا مسئلہ ہے۔ شاعر، کائنات، زندگی، موت، وقت اور خدا کے بارے مختلف سوال اٹھاتا ہے۔ان سوالوں کے سلسلہ میں وہ محض خرد کی فسوں کاری سے مطمئن نہیں ہوتا۔ شاعر تخلیق کے فلسفے کو اپنے دل کے نازک محسوسات کی مدد سے سمجھنا چاہتا ہے۔''(۱۰)

''موت'' ایک ایسا موضوع ہے جسے بہت سے شعرا نے اپنے تخیل کے بل بوتے پر برتا۔ جہان زندگی کی اہمیت ہے وہاں موت کے تصور سے ہی زندگی خوبصورت نظر آتی ہے اگر موت نہ ہو تو زندگی کا رنگ بے معنی لگتا ہے اسی طرح موت کے تصور کے لیے بھی زندگی کی رونق ضروری ہے۔ بعض اوقات بارِ زیست سے انسان اس قدر تھک جاتا ہے کہ اسے موت کے بازوں میں راحت محسوس ہوتی ہے۔ جہاں دوسرے شعرا نے اس مضمون کو محض فکری سطح پر برتا وہاں شہزاد احمد کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا۔ ۱۹۸۴ء میں جب کراچی میں

انھوں دل کا دورہ پڑا تو وہ ایک طرح سے مردہ قرار دیے جا چکے تھے،ڈاکٹرزان کی زندگی کی آس کھو بیٹھے تھے۔اس حادثے میں انھوں نے موت کے فرشتے کو بھی دیکھا اس کے بعد انھیں ایک نئی زندگی ملی،زندگی کی بہت سی سچائیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں مرنے سے پہلے نہیں دیکھا سمجھا جا سکتا یعنی اس تجربے سے گزرنا بذاتِ خود ایک تخلیقی عمل ہے جس کا اظہار شہزاد احمد نے اپنی کتاب ''ٹوٹا ہوا پل'' میں کیا۔موت کے بارے میں شہزاد احمد کہتے ہیں:

> ''جو لوگ شعور کی اعلیٰ منزلوں میں ہوتے ہیں،ان کے لیے قربِ موت کی واردات ایک طرح کی روشنی بن جاتی ہے۔نور کا ایک ایسا ہالہ ان کے گرد تعمیر ہو جاتا ہے جسے بعض اوقات دوسرے بھی محسوس کر سکتے ہیں''(۱۱)

شعری مثالیں دیکھیے:

یہ بھی ممکن ہے کہ بیداری مقدر ہی نہ ہو
موت سے پہلے بھی گہری نیند سو سکتا ہوں(۱۲)

اب قافلہ زیست ہی رک جائے تو رک جائے
یہ درد کی لذت تو کبھی کم نہیں ہو گی(۱۳)

شہزاد احمد غالبؔ اور اقبالؔ سے متاثر تھے۔وہ بنیادی طور پر کائنات کے حوالے سے کافی متجسّس تھے۔بنے بنائے اصولوں سے اکتاہٹ محسوس کرتے تھے بلکہ وہ کائنات کے حوالے سے اسرار و رموز کی کھوج لگانے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔یہی تازہ کاری کا ایک رجحان ہے جو ان کی شاعری میں موضوعاتی سطح پر انفرادیت بھی پیدا کرتا ہے اور معاصر شعرا سے منفرد بھی کرتا ہے۔سائنسی شعور ان کے ہاں ایک ایسا رویّہ ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی متجسّس روح اضطراب بھرے کائناتی مسائل سے دوچار ہے۔یہ سفر ان کے ہاں اندرونی اور بیرونی دونوں سطحوں پر حاوی نظر آتا ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''شہزاد احمد نے ہواؤں پر بنے ہوئے نقوش کو آنکھوں کے بغیر دیکھنے کی کوشش کی اور یہ کوشش ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ شہزاد احمد نے ظاہر کی آنکھ کو بند کر لیا تو باطن کی آنکھ کھول لی اور اب جو کائنات تھی،اس کائنات کی یاترا اگرچہ شہزاد احمد کے ہاں مکمل نہیں ہوئی تاہم وہ اس سفر سے تاحال اکتائے نہیں،ان کا سانس قائم اور دل کا دیا روشن ہے۔''(۱۴)

شعری کائنات کی لطافت اور سائنسی کائنات کی منطق دو الگ الگ چیزیں ہیں اور متضاد رجحان بھی ہیں۔یقیناً ان دونوں رجحانات کا اسلوب بھی الگ الگ ہے،ان دنوں اسلوب کو شعری زبان میں اس کامیابی کے ساتھ سمونا کہ غزل کی زبان بھی مجروح نہ ہو اور تغزل بھی برقرار رہے یہ مہارت کا نمونہ شہزاد احمد نے پیش کیا ہے۔مثال دیکھیے:

رفتار ہے ایسی کہ ٹھہرتی نہیں آنکھیں
ہے چرخ بھی چکر میں، ستارہ بھی رواں ہے(۱۵)

یہ کیا کہ شام و سحر روز ایک جیسے ہوں
یہ دائرہ ہے، اسے زندگی نہ اب کہنا(۱۶)

اب تو شہزادؔ ستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے(۱۷)

اُن کے باعث نظر آتا ہی نہیں چاند مرا
یہ ستارے تو ہٹا دینے کو جی چاہتا ہے(۱۸)

شہزاد احمد کی شاعری میں ایک اور فلسفیانہ مضمون بھی بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ جدید اردو غزل کے اہم موضوعات میں ایک موضوع یہ ہے کہ اکثر شعرا بہت سارے مسائل کا حل اپنی ذات کو سمجھتے ہیں اور کسی بھی طرح کی خرابی بے چینی یا اضطرابی کے محرکات بھی اپنی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کلاسیکی غزل کی روایت میں اگر بغور دیکھیں تو وہ عاشق کا نوحہ اس بات پر ہے کہ محبوب خفا ہے یا جدا ہے اور اس کا نوحہ اس وقت شادیانے میں بدل جاتا ہے جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محبوب سے ملاقات ہو گی یا اس کی جدائی ختم ہو جانے کو ہے۔ یعنی کلاسیکی شاعری میں محبوب کا خفا ہونا یا میسر ہونا ہی بڑے موضوعات ہیں مگر جدید اور مابعد جدید غزل میں محبوب ہی سب کچھ نہیں محبوب کا پہلو میں ہونا بھی عاشق کے لیے وجہ راحت نہیں بلکہ وہ اس کی موجودگی میں غائب اور اس کی عدم موجودگی میں اس کی موجودگی کے لطف تراشنے میں مصروف نظر آتا ہے۔

شہزاد احمد کے ہاں فلسفیانہ افکار کی بہتات ہے وہ بھی بعض اوقات اپنے بہت سارے مسائل کا حل اپنی ذات کو سمجھتے ہیں اور خود کی راہ میں اپنے وجود کو ہی رکاوٹ سمجھتے ہیں مثلاً:

مری ہی ذات مری تیرگی بھی ہے شہزاد
میں اپنی راہ میں حائل سہی، ہٹوں کیسے(۱۹)

مری ہستی ہے مثلِ سنگ و آہن
مگر بکھرا ہوا ذرات میں ہوں(۲۰)

یہ فلسفیانہ مزاج شاعر صرف ذات اور خارج کے فلسفیانہ مزاج میں ہی نہیں الجھا رہا بلکہ اس کے ہاں سماجی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہونے کا احساس بھی ملتا ہے۔ ہجرت سے لے کر ۲۰۱۲ء میں شہزاد احمد کی غزل ایک تاریخی دستاویز بھی ہے جہاں بہت سارے ملکی اور عالمی سطح کے مسائل کا رنگ ہمیں نظر آتا ہے۔ تقسیم اور تقسیم کے بعد کے معاملات، سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت، کشمیر کا موضوع، فلسطین کا موضوع ان تمام عالمی مسائل کے بارے میں بھی شہزاد احمد کے ہاں ایک موثر نقطہ نظر موجود ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیاں بھی ان کی نظر کے سامنے ہیں:

فلک کو چھوتی ہوئی یہ عمارتیں شہزادؔ
ہوس میں ڈوبی ہوئی عورتوں کے مندر ہیں(۲۱)

واسطہ رکھتے نہیں خاک نشینوں سے کوئی
اب پیمبر نہیں قوموں پہ خدا آتے ہیں(۲۲)

شہزاد احمد کی تربیت میں جس قسم کے ماحول کی کارفرمائی ہے اس میں سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، صلاح الدین ندیم، اور مظفر علی سیّد جیسے ادیبوں کا شمار ہے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کے افکار میں فلسفہ اور نفسیات کا عمل دخل تھا اس باعث شہزاد احمد بھی اس روش سے بہت حد تک اور بہت دیر تک متاثر رہے یہاں تک کہ ان کے اپنے افکار میں تشکیک کا پہلو غالب آ گیا۔ اصل میں ان کے بڑے بھائی شیخ محمد یوسف کے ہاں مختلف ادیبوں کا اٹھنا بیٹھنا تھا جو مختلف طرح کی فلسفیانہ مباحث کا ماحول بنائے رکھتے تھے۔ اس ماحول میں شہزاد احمد کی تربیت ہوئی۔ تقسیم کے پورے خونی منظر نامے کے وہ چشم دید گواہ بھی تھے اور خود بھی بہت سے مسائل سے براہِ راست گزرے بھی تھے۔ پھر ہجرت کے بعد مالی مشکلات اور بے روزگاری کا وہ شکار ہوئے جس کی وجہ سے وہ باطنی طور پر تشکیک کا شکار ہو گئے جس عمر میں انسان کو ایک مکمل یقین کی ضرورت ہوتی ہے اس عمر میں وہ بے یقینی کا شکار ہو گئے۔ خدا، مذہب اور عقائد کے بارے میں وہ وسوسوں اور واہموں کا شکار ہو گئے۔ ان کے ہاں تشکیک کے بہت سے پہلو ہیں اپنی ذات کے بارے میں، مذہب کے بارے میں، خدا کے بارے میں اور کائنات کے بارے میں قیامت کے موضوعات تک ان کے ہاں تشکیک کا رویہ پایا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد:

> ''شہزاد احمد کی آواز تشکیک میں گھرے ہوئے جدید انسان کی آواز ہے جو اپنے وجود میں معنویت کو تلاش کرتے ہوئے ایک جوکھم سے گزر رہا ہے۔ واہموں اور حقیقتوں کے تضادات اور ان سے رونما ہونے والی جدلیات میں انسانی زندگی کی بنتی بگڑتی صورتیں اور جذبوں کا اتار چڑھاؤ شہزاد کی شاعری کی شاعری کے مختلف رنگوں میں ڈھل جاتے ہیں۔''(۲۳)

ذرے ذرے سے تری خوشبو تو آتی ہے مجھے
یہ نہیں کھلتا کہ تو ظاہر ہے یا پوشیدہ ہے(۲۴)

غزل تقریباً اپنے ایک ہزار سالہ ارتقائی سفر میں منفرد اور نئے موضوعات کو اپنے اندر سموتی چلی آرہی ہے اور اپنے زمانے کے نئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتی آرہی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی اصل سے منسلک بھی ہے اور تازہ افکار کو اپنے اندر سمونے کے لیے رضامند بھی۔ شہزاد احمد کی غزل ایک پڑھے لکھے قاری کی غزل ہے جو صرف ایک وقتی ہیجان کی قائل نہیں بلکہ ایک ٹھہرے ہوئے اور سنبھلے ہوئے شعور کی غزل ہے۔ یہ ان کی بالغ نظری اور سنجیدگی کا عین ثبوت ہے کہ انھوں نے غزل جیسی رومانوی صنف کو موضوعاتی سطح پر ثروت مند کیا۔ کائنات کے بارے میں تجسس، موت اور حیات کے بارے میں عقائد، فطرت کے بارے میں بہت سارے سوالات شہزاد احمد کی غزل کی پہچان ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر، مشمولہ۔ دیباچہ، اربوں سال کی دوری، از، شہزاد احمد، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔ ص ۱۰
۲۔ انور مسعود، دیباچہ، جاگن والی رات ول اک جھات، مشمولہ، جاگن والی رات، از، شہزاد احمد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۱
۳۔ محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر۔ اربوں سال کی دوری، (فلیپ)
۴۔ شہزاد احمد۔ صدف۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۵۸۔ ص ۳۵۱
۵۔ شہزاد احمد۔ آنے والا کل، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵ء۔ ص ۹۳
۶۔ شہزاد احمد۔ صدف۔ ص ۲۵۴
۷۔ شہزاد احمد۔ جلتی بجھتی آنکھیں۔، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔ ص ۱۰۹
۸۔ ایضاً۔ ص ۹۰
۹۔ شہزاد احمد۔ صدف۔ ص ۲۰۹
۱۰۔ نیر صمدانی ڈاکٹر۔ اعتبارات۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۴۶
۱۱۔ شہزاد احمد۔ ژونگ۔ نفسیات اور مخفی علوم۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء۔ ص ۲۴۶
۱۲۔ شہزاد احمد۔ ایک چراغ اور بھی۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔ ص ۶۶
۱۳۔ شہزاد احمد۔ صدف۔ ص ۳۸۲
۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، گوشہ شہزاد احمد، مشمولہ، اوراق اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء، لاہور: ماہ نامہ، جلد ۳۰، شمارہ ۹۔ ص ۳۷۶
۱۵۔ شہزاد احمد۔ جلتی بجھتی آنکھیں۔ ص ۲۳۴
۱۶۔ شہزاد احمد۔ ادھ کھلا دریچہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء۔ ص ۱۸
۱۷۔ شہزاد احمد۔ جلتی بجھتی آنکھیں۔ ص ۲۴۳
۱۸۔ شہزاد احمد۔ کون اسے جاتا دیکھے۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔ ص ۳۱

۱۹۔ شہزاد احمد۔ ادھ کھلا دریچہ۔ ص ۱۱۳
۲۰۔ شہزاد احمد۔ کون اسے جاتا دیکھے۔ ص ۸۷
۲۱۔ شہزاد احمد۔ خالی آسمان۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء۔ ص ۹۷
۲۲۔ ایضاً۔ ص ۸۴
۲۳۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر۔ طرفیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔ ص ۹۵
۲۴۔ شہزاد احمد۔ اندھیرا دیکھ سکتا ہے۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔ ص ۲۶